***Journal of Religion & Society* (JR&S)**
Available Online:
https://islamicreligious.com/index.php/Journal/index
Print ISSN: 3006-1296Online ISSN: 3006-130X
Platform & Workflow by: Open Journal Systems
https://doi.org/10.5281/zenodo.23613020

The Role of ʿUrf in Kināyāt-e-Ṭalāq: A Comparative Study of Arabic and Urdu Expressions of Divorce

کنایاتِ طلاق میں "عُرف" کا کردار: عربی اور اردو الفاظِ طلاق کا تطبیقی مطالعہ

Mufti Irfan Fazil
PhD Scholar, Riphah International University, Islamabad
Irfazil660@gmail.com
Dr. Yasir Ahmad Zeerak
Assistant Professor, Bahria University Islamabad
yasirzeerak@gmail.com

Abstract
In Islamic law, marriage is a sacred and enduring covenant whose preservation is of fundamental importance. Nevertheless, a legal framework for divorce has been prescribed to provide for the dissolution of this bond under unavoidable circumstances. In Islamic jurisprudence, expressions of divorce are broadly classified into two categories: ṣarīḥ (explicit) and kināyah (allusive). The pronouncement of divorce through explicit expressions does not require the intention of the husband, whereas the effectiveness of allusive expressions generally depends on the husband's intention, contextual indications and prevailing custom (ʿurf).

This study examines the influence of ʿurf on the identification of kināyāt-e-ṭalāq and their legal consequences from jurisprudential, legal and linguistic perspectives. In particular, drawing upon the principles of Ḥanafī jurisprudence, it explores the nature of ʿurf, its legal authority in Islamic law, its various classifications, the conditions governing its validity and the transformation of customary expressions with the passage of time. It also presents a comparative and applied analysis of commonly used allusive expressions of divorce in Arabic and Urdu. It demonstrates that certain expressions, despite their original lexical meanings, may become exclusively associated with divorce through established verbal custom (ʿurf qawlī) and consequently acquire the status of ṣarīḥ ʿurfī (customarily explicit expressions). Nevertheless, regional and juristic differences also exist regarding the legal consequences of these expressions, as illustrated by variations in customary usage between Khyber Pakhtunkhwa and other regions.

The study concludes that the customs prevailing in a particular time and place, the circumstances of the speaker, intention and the surrounding context cannot be disregarded when determining the legal implications of allusive expressions of divorce. Accordingly, it recommends the compilation of a comprehensive jurisprudential lexicon of customary expressions, the involvement of linguistic experts in judicial proceedings and greater public awareness of the relevant legal and religious rulings.

Keywords: *Kināyāt-e-Ṭalāq, Custom and Usage (ʿUrf wa ʿĀdah), Ḥanafī Jurisprudence, Arabic and Urdu Expressions, Changing Times.*

تمہید:

شریعتِ اسلامیہ میں خاندانی نظام کے استحکام اور بقا کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، تاہم ناگزیر حالات میں نکاح کے خاتمے کے لیے طلاق کا قانون وضع کیا گیا ہے۔ فقہِ اسلامی کی رو سے الفاظِ طلاق اپنی دلالت کے اعتبار سے صریح اور کنایہ میں منقسم ہیں۔ صریح الفاظ وہ ہیں جو اپنے مفہوم میں اتنے واضح ہوں کہ بولتے ہی طلاق واقع ہو جائے، جب کہ کنایات سے مراد وہ الفاظ ہیں جن میں طلاق اور غیر طلاق دونوں کا احتمال پایا جاتا ہے۔ کنائی الفاظ کے مبہم ہونے کے باعث فقہاء نے ان کے شرعی حکم کے تعین کے لیے نیت کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی اہم اصول پر تکیہ کیا ہے، جسے فقہِ اسلامی کی اصطلاح میں "عرف وعادت" کہا جاتا ہے۔ مسلم معاشرے کا لغوی اور سماجی رواج (عرف) بعض اوقات کنائی یا مبہم الفاظ کو ایک خاص تناظر میں طلاق کے لیے اس قدر متعین کر دیتا ہے کہ وہ بول چال میں صریح کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں اسی "عرف" کے کلیدی کردار کو بنیاد بنا کر عربی اور اردو زبانوں میں رائج کنایاتِ طلاق کا ایک تطبیقی و فقہی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تحقیق کا بنیادی مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ کس طرح کلاسیکی عربی فقہ میں مذکور کنائی الفاظ اپنے معاصر سماجی عرف کے تابع تھے، اور عصرِ حاضر میں برصغیر پاک و ہند کے لسانی و تہذیبی عرف نے اردو کے بعض کنائی محاورات اور الفاظ کو عملی طور پر طلاقِ صریح کے کس قدر قریب کر دیا ہے۔ لسانیات، سماجی رواج اور فقہِ حنفی کے مسلّمہ قواعد کی روشنی میں یہ مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ تغیرِ زمانہ اور لغوی ارتقا کے باعث احکامِ طلاق کی تفہیم اور ان کے نفاذ میں عرفِ عام کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں، کیونکہ شریعت نے نصِ قطعی سے متصادم نہ ہونے والے صالح عرف کو ہمیشہ ایک معتبر قانونی دلیل کے طور پر تسلیم کیا ہے۔

مقاصد تحقیق:

1۔ نکاح، طلاق اور الفاظِ طلاق کے فقہی، سماجی اور لسانی پس منظر کو واضح کرنا۔

2۔ طلاق کے لغوی اور شرعی مفہوم کو واضح کرنا اور فقہی اصطلاح میں اس کی حقیقت متعین کرنا۔

3۔ الفاظِ طلاق کی اقسام اور ان کے شرعی احکام کا اصولی جائزہ لینا۔

4۔ کنائی الفاظ کی فقہی اور لسانی درجہ بندی کو بیان کرنا اور ان کی دلالت کے فرق کو واضح کرنا۔

5۔ متکلم کی حالت، نیت اور سیاق و سباق کے اعتبار سے کنایاتِ طلاق کے احکام کا تجزیہ کرنا۔

6۔ عرف اور عادت کی حقیقت، تشکیل اور فقہی اثرات کو واضح کرنا۔

7۔ عرف کی شرعی حیثیت، اقسام اور اس کے معتبر ہونے کی شرائط کا تحقیقی مطالعہ کرنا۔

8۔ تغیرِ زمانہ کے نتیجے میں احکام اور عرفی تعبیرات میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینا۔

9۔ عربی کنایاتِ طلاق پر عرف کے اثرات کا فقہی و تطبیقی مطالعہ کرنا۔

10۔ اردو محاورات اور معاصر عرفی تعبیرات پر طلاق کے احکام کے اطلاق کا تحقیقی جائزہ لینا۔

نکاح کی معاشرتی اور دینی اہمیت:

شریعتِ اسلامیہ میں خاندانی نظام کی استواری اور صالح معاشرے کی تشکیل کی بنیاد عقدِ نکاح پر رکھی گئی ہے۔ نکاح محض دو افراد کے مابین کوئی عارضی، مادی یا خالص قانونی معاہدہ (Civil Contract) نہیں ہے، بلکہ یہ ایک انتہائی مقدس، پائیدار اور عمیق دینی و سماجی عہد ہے۔ قرآن مجید نے میاں بیوی کے اس باہمی تعلق اور میثاق کو "مِيثَاقًا غَلِيظًا" (ایک نہایت مضبوط اور بھاری عہد) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بندھن عفت و پاک دامنی کے تحفظ، افزائشِ نسل اور انسانی نفس کے سکون و تسکین کا واحد شرعی ذریعہ ہے۔ شریعتِ مطہرہ نے اس عقد کو دوام، استحکام اور تقدس بخشنے کے لیے ایسے جامع احکام و ضوابط مقرر کیے ہیں تاکہ انسانی معاشرت کی یہ بنیادی اکائی کسی بھی قسم کے انتشار، وقتی جذبات یا معمولی تلخیوں کی وجہ سے بکھرنے نہ پائے[1]۔

[1]۔ ابو بکر بن مسعود کاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (کوئٹہ: مکتبہ رشیدیہ، 1989ء)، 2/ 227۔

طلاق کی مشروعیت اور اس کا اساسی مقصد:

انسانی طبائع، افکار اور نفسیات میں تفاوت ایک فطری امر ہے۔ بعض اوقات میاں بیوی کے درمیان تفہیم اور مطابقت پیدا کرنے کی تمام تر مخلصانہ کوششوں، خاندان کے بزرگوں کی ثالثی اور اصلاحِ احوال کے تمام ممکنہ مروجہ طریقوں کے باوجود حسنِ معاشرت اور باہمی نباہ کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ ایسی ناگزیر اور مخدوش صورتِ حال میں، جہاں نکاح کا برقرار رہنا فریقین کے لیے سکون کے بجائے ایک مستقل عذاب، ظلم اور اخلاقی و نفسیاتی پستی کا سبب بن جائے، اسلام اپنے دینِ فطرت ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ شریعت نے جہاں نکاح کو دائمی طور پر قائم رکھنے کی ترغیب دی، وہیں ایسی لاچارگی کی حالت میں فریقین کو ایک دوسرے سے پرامن، باوقار اور احسن طریقے سے علاحدگی اختیار کرنے کا راستہ بھی فراہم کیا ہے۔ طلاق کی تشریع کا اصل مقصد میاں بیوی کو اس مسلسل تنگی اور ضرر سے نجات دلانا ہے جو عدمِ رغبت اور شدید نفرت کے باوجود باہم جڑے رہنے سے پیدا ہوتی ہے[2]۔

طلاق کا شرعی نقطۂ نظر اور اس کی کراہت:

اگرچہ طلاق کو ناگزیر حالات میں ایک آخری شرعی حل اور متبادل کے طور پر جائز رکھا گیا ہے، مگر شریعتِ اسلامیہ کا اصل منشاء اور ترجیح طلاق دینا نہیں بلکہ عقدِ نکاح کو قائم رکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مباحات (جائز کاموں) میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ سنن ابی داؤد کی روایت میں اس کی صراحت درج ذیل الفاظ میں ملتی ہے: " أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى الطَّلَاقُ [3]۔ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے)۔

بغیر کسی معقول، شرعی اور حقیقی عذر کے طلاق کا حق استعمال کرنا معاشرتی تخریب اور خاندانی شیرازہ بکھرنے کا باعث بنتا ہے، اسی لیے ائمہ وفقہاء نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ طلاق میں اصل حکم ممانعت اور کراہت کا ہے اور اس کی اباحت صرف اور صرف حاجتِ شدید اور ضرورتِ مبرمہ کے وقت ہی ثابت ہوتی ہے[4]۔

الفاظِ طلاق اور فہمِ مراد میں "عرف" کی اصولی حیثیت:

شریعتِ مطہرہ میں طلاق کے وقوع اور عدمِ وقوع کا تمام تر مدار ان الفاظ، تعبیرات اور جملوں پر ہوتا ہے جو شوہر کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ کلام کی لسانی دلالت اور بولنے والے (متکلم) کی اصل مراد و نیت کو درست تناظر میں سمجھنے کے لیے اسلامی قانون اور علمِ اصولِ فقہ میں "عرف اور عادت" (Custom and Usage) کو ایک اساسی اور کلیدی ضابطے کی حیثیت حاصل ہے۔ فقہاء نے الفاظِ طلاق کو دلالت کے اعتبار سے دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا ہے: صریح اور کنایہ۔ صریح الفاظ وہ ہیں جو لغت اور رواج میں طلاق کے معنی کے لیے اس طرح متعین ہو چکے ہوں کہ سنتے ہی طلاق کا معنی متبادر ہو۔ اس کے برعکس کنایات وہ مبہم الفاظ ہیں جن میں طلاق کے ساتھ ساتھ دیگر معانی (جیسے غصے کا اظہار، توبیخ یا محض دھمکی) کا بھی احتمال پایا جاتا ہے۔

کسی دور، خطے یا معاشرے میں جب کچھ مخصوص کنائی الفاظ میاں بیوی کے باہمی تعامل یا جھگڑے کے دوران طلاق ہی کے معنی کے لیے مروجہ طور پر خاص ہو جائیں، تو وہاں متکلم کی نیت کا فیصلہ کرنے اور لفظ کے شرعی حکم کا تعین کرنے کے لیے "عرفِ قولی" کو حکم اور فیصل بنایا جاتا ہے، چنانچہ کنایاتِ طلاق کا شرعی حکم متعین کرنے، ان کے لسانی ارتقاء کا جائزہ لینے اور عربی کے قدیم کنائی الفاظ کا جدید اردو محاورات کے ساتھ تطبیقی مطالعہ کرنے کے لیے عرف کی اصولی و فقہی حیثیت کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ یہ تحقیق اسی تناظر میں عرف کے اثرات کو واشگاف کرنے کے لیے مرتب کی جا رہی ہے[5]۔

طلاق کا لغوی و شرعی مفہوم:

لفظ "طلاق" مادہ (ط ل ق) سے مشتق ہے، جو باب "طَلَقَ يطْلُقُ" (بمعنی چھوٹ جانا) اور "أَطْلَقَ يُطْلِقُ إِطْلَاقًا" (بمعنی چھوڑ دینا یا آزاد کرنا) کا مصدر ہے۔

---

[2]۔ محمد امین ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار (کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، 1986ء)، 3/ 226۔

[3]۔ سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابی داؤد (بیروت: المکتبۃ العصریۃ، 2009ء)، 2/ 256، رقم الحدیث: 2178۔

[4]۔ کاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، 2/ 228۔

[5]۔ محمد امین ابن عابدین، نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف (ضمن رسائل ابن عابدین) (لاہور: سہیل اکیڈمی، 2004ء)، 2/ 114۔

اس کا بنیادی اور اساسی معنی کسی بھی قسم کی حسی یا معنوی قید، بندھن یا گرہ کو کھول دینے اور کسی کو بالکل آزاد کر دینے یا چھوڑ دینے کے ہیں۔ اہلِ لغت کے ہاں اس کا استعمال مختلف تعبیرات میں ملتا ہے۔ مشہور لغوی امام ابن منظور افریقی لسان العرب میں رقم طراز ہیں: "والإطْلاقُ: ا لتَّخْلِيَةُ والإرْسالُ، وطَلَقَ الأَسيرَ أَيْ خَلّى عَنْهُ وأَعْتَقَهُ منْ إسَارِه" [6]۔ (اور اطلاق کے معنی کسی کو چھوڑ دینے اور آزاد کر دینے کے ہیں اور جب کہا جائے کہ اس نے اسیر کو طلاق دی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے قیدی کو رہا کر دیا اور اس کی قید کے بندھن کو ختم کر دیا)، لہٰذا لغوی اعتبار سے یہ لفظ ہر اس مادی یا معنوی بندھن کو یکسر ختم کر دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی شے کو آزادی حرکت سے روکے ہوئے ہو۔

شریعتِ اسلامیہ کی اصطلاح میں لغوی معنی (بندھن کھولنے) کو برقرار رکھتے ہوئے اس کا دائرۂ کار عقدِ نکاح پر منطبق کیا گیا ہے۔ فقہی اصطلاح میں مخصوص، صریح یا کنائی الفاظ کے استعمال کے ذریعے، جو شرعاً اس مقصد کے لیے وضع کیے گئے ہوں، نکاح کے قانونی اور دینی بندھن (قیدِ نکاح) کو فوری طور پر یا بالآخر ختم کر دینے کو طلاق کہا جاتا ہے۔ فقہائے احناف کی معتبر کتاب "الہدایہ" میں طلاق کی شرعی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: "ا لطَّلَاقُ: هُوَ رَفْعُ قَيْدِ النِّكَاحِ فِي الْحَالِ أَوِ الْمَآلِ بِلَفْظٍ مَخْصُوصٍ" [7]۔ (طلاق سے مراد مخصوص لفظ کے ذریعے نکاح کے بندھن کو فوری طور پر یا انجام کار کے اعتبار سے اٹھا دینا ہے)۔

اس جامع شرعی تعریف میں دو اہم ترین فقہی صورتوں کا احاطہ کیا گیا ہے:

1. فی الحال (Immediate Termination): اس سے مراد "طلاقِ بائن" (خواہ بائن خفیفہ ہو یا غلیظہ) ہے، جس کے زبان سے ادا ہوتے ہی نکاح کا شرعی بندھن فوری طور پر ٹوٹ جاتا ہے اور عورت شوہر کی زوجیت سے نکل جاتی ہے۔
2. فی المآل (Eventual Termination): اس سے مراد "طلاقِ رجعی" ہے، جس میں لفظ ادا ہونے سے بندھن فوری طور پر نہیں ٹوٹتا، بلکہ عدت گزرنے کے بعد نکاح مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے اور اس دوران شوہر کو رجوع کا حق حاصل رہتا ہے۔

یوں شریعت کی رو سے طلاق وہ قانونی طریقہ کار ہے جو میاں بیوی کے درمیان قائم شدہ حلال رشتے کو یکسر ختم کر کے انہیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنا دیتا ہے۔

لسانی دلالت کی حساسیت اور اس کا پس منظر:

عقدِ نکاح ایک پائیدار، دائمی اور غیر معمولی سماجی و مذہبی معاہدہ ہے، اس لیے شریعتِ اسلامیہ نے اسے ختم کرنے کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ کی نوعیت، ان کے لسانی پس منظر اور ان کی دلالتِ عرفی کو انتہائی حساس اور نازک قرار دیا ہے۔ طلاق محض ایک جذباتی جملہ نہیں، بلکہ ایک ایسا قانونی حکم (Legal Pronouncement) ہے جس کے نافذ ہوتے ہی حرام و حلال کی حدود تبدیل ہو جاتی ہیں، نسب کا تحفظ خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وراثت و نفقہ جیسے اہم حقوق متاثر ہوتے ہیں۔ جب کوئی شوہر کلام کرتا ہے تو اس کے الفاظ کی تین قسم کی دلالتیں سامنے آتی ہیں:

- دلالتِ وضعی (لغوی): لفظ اپنی اصل لغت میں کس چیز کے لیے بنا ہے۔
- دلالتِ عرفی: وہ لفظ اس مخصوص معاشرے اور ماحول میں مروجہ طور پر کیا معنی دے رہا ہے۔
- دلالتِ حالی (سیاق و سباق): وہ جملہ کس حالت (رضا، غصہ یا مذاکرہ) میں بولا گیا ہے۔

اگر الفاظ صریح ہوں تو ان کی لسانی دلالت اتنی قوی ہوتی ہے کہ وہاں شوہر کی نیت یا غصے کا پس منظر کوئی اثر نہیں رکھتا، طلاق قضاءً واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن جب معاملہ "کنایاتِ طلاق" (Implicit Words) کا ہو، جہاں لفظ میں طلاق کے علاوہ دیگر معانی کا بھی احتمال ہو تو وہاں لسانی دلالت کی حساسیت دگنی ہو جاتی ہے۔ وہاں متکلم کے الفاظ کو محض لغت کے ترازو میں نہیں تولا جاتا، بلکہ اس خطے کے لسانی عرف، محاورے اور شوہر کے نفسیاتی پس منظر کا گہرا جائزہ لینا شرعاً لازم ہوتا ہے تاکہ کسی مسلمان

---

[6]۔ ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب (بیروت: دار صادر، 2004ء)، 10/ 225۔

[7]۔ علی بن ابی بکر مرغینانی، الہدایہ فی شرح بدایہ المبتدی (ملتان: مکتبہ امدادیہ، 1425ھ)، 2/ 245۔

کا قائم شدہ رشتہ بغیر کسی قطعی ثبوت کے محض شبہے یا مبہم لفظ کی بنیاد پر ختم نہ ہو جائے[8]۔

الفاظِ طلاق کی اقسام اور ان کا شرعی حکم:

فقہائے اسلام نے طلاق کے وقوع، عدمِ وقوع اور متکلم (بولنے والے) کی اصل مراد کا قطعی فیصلہ کرنے کے لیے الفاظِ طلاق کو صراحت (Clarity) اور ابہام (Ambiguity) کے اعتبار سے بالاتفاق دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا ہے، جنہیں "صریح" اور "کنایہ" کہا جاتا ہے۔ یہ تقسیم محض لسانی یا نحوی نہیں ہے، بلکہ اس کا گہرا تعلق احکامِ شرعیہ کے ترتب، حقوقِ زوجیت کے تحفظ اور طلاق کے مروجہ قانونی و قضائی نتائج سے ہے تاکہ مسلم معاشرے میں حلال و حرام کی حدود کا تعین بغیر کسی شبہے کے کیا جا سکے[9]۔

الف) طلاقِ صریح (Explicit Divorce): طلاقِ صریح سے مراد وہ واضح، دوٹوک اور غیر مبہم الفاظ ہیں جو اپنی اصل وضع لغوی، شرعی تحدید یا معاشرے کے قطعی تعاملِ عرفی کی بنا پر خاص طلاق کا معنی دینے کے لیے ہی مقرر کیے گئے ہوں۔ جب یہ الفاظ متکلم کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، تو سننے والے کے ذہن میں کسی بھی قسم کے تردد، تاویل یا شک کے بغیر فوری طور پر صرف اور صرف عقدِ نکاح کو ختم کرنے کا معنی ہی متبادر ہوتا ہے۔ ان الفاظ میں طلاق کے علاوہ کسی دوسرے دنیوی یا اخلاقی معنی (مثلاً عارضی خفگی، ڈانٹ ڈپٹ یا تادیب) کا کوئی معقول اور قانونی احتمال نہیں پایا جاتا، جیسے کوئی شوہر اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر صراحت کے ساتھ یہ جملے کہے: "میں نے تمہیں طلاق دی"، "تو طلاق یافتہ ہے"، یا عربی زبان کے مروجہ صیغے استعمال کرتے ہوئے کہے: "أنتِ طالق" (تو طلاق والی ہے)۔ ان جملوں کو سنتے ہی قانونی طور پر طلاق کا وقوع ثابت ہو جاتا ہے۔

حکم:

طلاقِ صریح کا حکم یہ ہے کہ اس کے وقوع اور نفاذ کے لیے شوہر کی "نیت"، دلی ارادہ یا قلبی رضا قطعاً شرط نہیں ہے۔ یہ الفاظ زبان سے صادر ہوتے ہی قضاءً (قانوناً) اور دیانتاً (شرعاً) نافذ ہو جاتے ہیں، خواہ متکلم نے یہ الفاظ شدید غصے کی حالت میں کہے ہوں، محض ہنسی مذاق یا تمسخر کے طور پر بولے ہوں، یا بغیر سوچے سمجھے لغزشِ لسانی کے سبب زبان سے نکل گئے ہوں۔ شریعتِ اسلامیہ نے خاندانی نظام کی حساسیت کے پیشِ نظر اس معاملے میں حد درجہ سختی برتی ہے تاکہ نکاح کے اس پائیدار عہد کو کھیل تماشا نہ بنایا جائے۔ اس حکم کی اصل بنیاد رسول اللہ ﷺ کا وہ فرمانِ مبارک ہے جو سننِ اربعہ میں معتبر سند کے ساتھ منقول ہے: "ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ، وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: النِّكَاحُ، وَالطَّلَاقُ، وَالرَّجْعَةُ"[10]۔ (تین چیزیں ایسی ہیں جن کا حقیقت میں کہنا بھی حقیقت ہے اور مذاق میں کہنا بھی حقیقت ہی مانا جائے گا: نکاح، طلاق اور رجوع)۔

چنانچہ اگر کوئی شوہر صریح لفظ ادا کرنے کے بعد عدالت یا مفتی کے سامنے یہ عذر پیش کرے کہ "میری نیت طلاق کی نہیں تھی، بلکہ میں تو صرف بیوی کو ڈرا دھمکا رہا تھا"، تو شرعی قانون کے مطابق اس کا یہ دعویٰ یکسر مردود قرار پائے گا اور طلاقِ رجعی (یا بائن، حسبِ الفاظ) واقع ہو جائے گی[11]۔

طلاقِ کنایہ:

کنایہ لغت میں پوشیدہ بات یا مبہم کلام کو کہتے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں کنایاتِ طلاق سے مراد وہ مبہم، ذو معنی اور کثیر الاحتمال الفاظ یا تعبیرات ہیں جو اپنی اصل لغوی وضع کے اعتبار سے طلاق کے معنی کے لیے خاص طور پر مقرر نہیں کی گئیں۔ ان الفاظ میں طلاق کا مفہوم نکلنے کے ساتھ ساتھ دیگر معاشرتی معانی جیسے بیوی سے عارضی بیزاری کا اظہار، اسے گھر سے رخصت کرنے یا محض ڈانٹنے وغیرہ کا برابر احتمال پایا جاتا ہے۔ چونکہ ان الفاظ کا مفہوم واضح نہیں ہوتا، اس لیے ان کی لسانی دلالت کمزور (Implicit) ہوتی ہے، جیسے لڑائی جھگڑے کے دوران یا عام حالات میں شوہر کا بیوی سے یہ کہنا: "اپنے گھر چلی جا"، "تو مجھ سے الگ ہے"، "اب میرا تجھ

---

[8] ۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، 3/ 230۔

[9] ۔ شیخ نظام الدین اور علمائے ہند، الفتاویٰ الہندیہ (کوئٹہ: مکتبہ ماجدیہ، 1983ء)، 1/ 354۔

[10] ۔ محمد بن عیسیٰ ترمذی، سنن الترمذی (بیروت: دار الغرب الاسلامی، 1998ء)، 2/ 483، رقم الحدیث: 1184۔

[11] ۔ علی بن ابی بکر مرغینانی، الہدایہ، 2/ 246۔

سے کوئی شرعی واسطہ نہیں"، "جا کر اپنا راستہ دیکھ" یا "اپنے باپ کے گھر جا کر بیٹھو"۔

حکم:

چونکہ کنائی کلام میں معانی کے متعدد احتمالات پائے جاتے ہیں، اس لیے ان کا شرعی حکم طلاقِ صریح سے یکسر مختلف ہے۔ کنایاتِ طلاق کے ذریعے طلاق تب تک واقع نہیں ہوتی جب تک کہ دو بنیادی شرطوں میں سے کوئی ایک شرط عملاً موجود نہ ہو:

1. شوہر کی صریح نیت: متکلم (شوہر) اعتراف کرے کہ ان مبہم الفاظ کو بولتے وقت اس کی دلی نیت اور ارادہ صرف طلاق دینے کا ہی تھا۔
2. دلالتِ حال (Socio-situational context): یعنی کلام کے وقت کے ظاہری حالات، قرائن اور گرد و پیش کا ماحول واضح طور پر طلاق پر دلالت کر رہا ہو (مثلاً میاں بیوی کے درمیان طلاق کا باقاعدہ تذکرہ اور مطالبہ چل رہا ہو، جسے فقہ کی اصطلاح میں "مذاکرۂ طلاق" کہا جاتا ہے)۔

اگر شوہر عام حالتِ رضا (خوش گواری) میں یہ الفاظ بولے اور بعد میں نیت کا انکار کر کے قسم کھالے تو دیانتاً طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ یہاں "الأمور بمقاصدها" (معاملات کا مدار ان کے مقاصد اور نیتوں پر ہے) کا قاعدہ لاگو ہوتا ہے، تاہم اگر یہ الفاظ شدید غصے یا مذاکرۂ طلاق کے وقت بولے جائیں تو وہاں متکلم کے عرف اور اس خطے کے لسانی رواج کو دیکھا جاتا ہے۔ اگر وہ کنائی الفاظ اس معاشرے کے "عرف" میں طلاق کے لیے اتنے عام ہو چکے ہوں کہ غصے میں ان کا بولنا طلاق ہی سمجھا جاتا ہو، تو وہ کنایہ لفظ "صریح عرفی" کا حکم اختیار کر لیتا ہے، جس کی تفصیلی تطبیق آگے آ رہی ہے[12]۔

کنائی الفاظ کی فقہی و لسانی درجہ بندی:

فقہائے احناف اور جمہور اہلِ علم نے کنایاتِ طلاق (Implicit Words) کے ابہام کو دور کرنے اور متکلم کی پوشیدہ نیت کا شرعی و قضائی فیصلہ کرنے کے لیے ان الفاظ کو محض لغوی قواعد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ کلام کے وقت متکلم کی نفسیاتی کیفیت، فریقین کے مابین جاری گفتگو کے سیاق و سباق (Context) اور دلالتِ حال کے اعتبار سے کنائی الفاظ کو تین بنیادی اصطلاحی اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ یہ درجہ بندی اس لیے ناگزیر ہے کہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ کس حالت میں شوہر کے لفظ کا ظاہری رجحان طلاق کی طرف ہے اور کس حالت میں طلاق کے علاوہ دیگر معاشرتی معانی کا احتمال زیادہ قوی ہے[13]۔

کنائی الفاظ کی تین بنیادی اقسام:

کنائی الفاظ کی بنیادی طور پر تین اقسام ہیں:

1۔ احوالِ ردو ترک (State of Rejection / Refusal): اس سے مراد وہ کنائی الفاظ اور جملے ہیں جن کے لغوی اور معنوی سیاق سے یہ ظاہر ہو رہا ہو کہ شوہر بیوی کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کر رہا ہے، اسے گھر سے رخصت کرنا چاہتا ہے، یا عارضی طور پر باہمی تعلق کو معطل (Suspend) کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، جیسے شوہر کا بیوی سے غصے یا عام حالت میں یہ کہنا: "اپنے گھر جا کر بیٹھو"، "اٹھو اور یہاں سے چلی جاؤ"، یا "اپنے والدین کے ہاں چلی جا"۔

فقہی حکم:

ان الفاظ میں چونکہ طلاق کے ساتھ ساتھ محض عارضی دوری، تادیب (سبق سکھانے) یا مائیکے بھیجنے کا احتمال حد درجہ قوی ہوتا ہے، اس لیے ائمہ و فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان الفاظ کے بولنے سے طلاقِ صریح کی قطعی نیت کے بغیر طلاق کسی صورت واقع نہیں ہوتی۔ اگر شوہر نیت کا انکار کر دے تو اس کا قول قسم کے ساتھ معتبر مانا جائے گا[14]۔

2۔ احوالِ سبّ و شتم (State of Abuse / Insult): اس سے مراد وہ الفاظ اور تراکیب ہیں جو میاں بیوی کے درمیان شدید لڑائی جھگڑے، گالی گلوچ اور طعن و تشنیع کے دوران فریقِ مخالف کو زک پہنچانے، نیچا دکھانے یا اس کی توہین و تحقیر کے لیے بولے جاتے ہیں، جیسے شوہر کا اشتعال انگیزی میں یہ کہنا: "تو میری بیوی

---

[12]۔ الزیلعی، فخر الدین عثمان بن علی، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2000ء)، 2/ 215۔

[13]۔ ابو بکر بن مسعود کاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، 2/ 238۔

[14]۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، 3/ 240۔

نہیں ہے"، "میرا تجھ سے کوئی رشتہ نہیں"، "جا کر اپنا راستہ دیکھ" یا "تو مجھ پر حرام ہے"۔

فقہی حکم:

غصے اور سبّ و شتم کی حالت اس بات کا قرینہ (Indication) ہوتی ہے کہ شوہر غیظ و غضب میں آ کر رشتہ توڑنے کا ارادہ کر سکتا ہے، تاہم ان الفاظ میں اب بھی محض ڈانٹ ڈپٹ اور شدید ناراضی کے اظہار کا احتمال باقی رہتا ہے۔ احناف کے ہاں اصول یہ ہے کہ ان الفاظ سے طلاق واقع ہونے کے لیے بھی نیت کا ہونا ضروری ہے، الّا یہ کہ وہ الفاظ اس خطے کے "عرف" میں طلاق کے لیے اس طرح مروج ہو چکے ہوں کہ غصے میں ان کا بولنا طلاق ہی سمجھا جاتا ہو[15]۔

3۔ احوالِ جوابِ مذاکرہ (Response to Divorce Discussion): اس سے مراد وہ کنائی کلام ہے جو اس وقت صادر ہو جب فریقین کے مابین پہلے ہی سے باقاعدہ طلاق کا تذکرہ، مطالبہ یا جھگڑا چل رہا ہو، مثلاً عورت یا اس کے گھر والے شوہر سے طلاق کا تقاضا کر رہے ہوں اور شوہر اس کے جواب میں کوئی کنائی لفظ بولے، جیسے بیوی کہے کہ "مجھے طلاق دو" اور شوہر جواب میں کہے: "میں نے تجھے الگ کر دیا"، "جا تو آزاد ہے"، یا "میں نے تیری رسی تیرے کندھے پر ڈال دی"۔

فقہی حکم:

کنایاتِ طلاق میں یہ حالت سب سے زیادہ نازک اور حساس ہے۔ فقہی ضابطے کے مطابق "مذاکرۂ طلاق" کا جاری ہونا دیگر تمام احتمالات (جیسے ڈانٹنا، مائیکے بھیجنا یا تحقیر کرنا) کو یکسر ختم کر دیتا ہے اور شوہر کے کلام کو متعین طور پر طلاق کے معنی پہنا دیتا ہے، لہٰذا جوابِ مذاکرہ کی حالت میں اگر شوہر ایسے کنائی الفاظ بولے جن کا جھکاؤ رشتہ ختم کرنے کی طرف ہو تو نیت کے بغیر بھی طلاقِ بائن واقع ہو جاتی ہے اور قضاءً شوہر کا یہ عذر قبول نہیں کیا جاتا کہ میری نیت طلاق کی نہیں تھی[16]۔

متکلم کی حالت کے اعتبار سے کنایاتِ طلاق کے احکام:

فقہِ اسلامی بالخصوص فقہائے احناف کے ہاں کنایہ الفاظ (Implicit Words) کے ذریعے طلاق کے وقوع یا عدمِ وقوع کا دارومدار محض لفظ کی لغوی حیثیت یا وضعِ اساسی پر نہیں ہوتا۔ چونکہ کنائی کلام میں معانی کے متعدد احتمالات پائے جاتے ہیں، اس لیے کلام کے سیاق و سباق (Context)، متکلم کی نفسیاتی کیفیت اور گرد و پیش کے ظاہری قرائن کو شرعی حکم کا فیصلہ کرنے کے لیے بنیاد بنایا جاتا ہے۔ فقہاء نے اس سلسلے میں متکلم (شوہر) کی حالت کو تین بنیادی مدارج میں تقسیم کر کے نہایت منصفانہ اور محتاط احکام وضع کیے ہیں، جن کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے[17]۔

اول: حالتِ رضا اور اس کا شرعی ضابطہ: جب شوہر کسی جھگڑے یا طلاق کے تذکرے کے بغیر عام حالتِ خوشی و رضا میں کوئی ایسا کنائی جملہ بولے جس میں طلاق کا احتمال ہو تو شرعی قانون کے مطابق ظاہر حال طلاق کی نفی کرتا ہے[18]، چونکہ کلام کا پس منظر پُرامن ہے، اس لیے یہاں طلاق کا معنی مراد لینے کے لیے کوئی ظاہری قرینہ موجود نہیں ہوتا۔ چنانچہ ائمہ احناف کا اصول ہے کہ ایسی حالت میں کنایہ لفظ سے طلاق صرف اور صرف شوہر کی دلی نیت سے ہی واقع ہو گی۔ اگر بیوی طلاق کا دعویٰ کرے اور شوہر عدالت میں بیان دے کہ "میرا ارادہ طلاق کا نہیں تھا"، تو شوہر سے قسم لی جائے گی اور قضاءً (عدالتی طور پر) اس کا بیان نافذ العمل ہو گا[19]۔

دوم: مذاکرۂ طلاق اور دلالتِ حال کا اثر: مذاکرۂ طلاق (Discussion of Divorce) کی حالت کنایاتِ طلاق کو صریح کے حکم میں لا کھڑا کرتی ہے۔ جب گفتگو کا رخ ہی طلاق کی طرف ہو اور اسی دوران شوہر مبہم لفظ ادا کرے تو عقل اور قانون کا تقاضا یہی ہے کہ اس لفظ سے شوہر کی مراد طلاق ہی تھی۔ امام کاسانیؒ بدائع الصنائع میں فرماتے ہیں کہ مذاکرۂ طلاق کی حالت دیگر تمام احتمالات کو مسترد کر دیتی ہے[20]، تاہم اس حالت میں فقہاء نے ایک باریک استثناء (Exception) رکھا ہے کہ وہ

---

[15]۔ شیخ نظام الدین اور علمائے ہند، الفتاویٰ الہندیہ، 1/ 374۔

[16]۔ مرغینانی، الہدایہ، 2/ 250۔

[17]۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، 3/ 242۔

[18]۔ کاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، 2/ 240۔

[19]۔ شیخ نظام الدین اور علمائے ہند، الفتاویٰ الہندیہ (کوئٹہ: مکتبہ ماجدیہ، 1983ء)، 1/ 375۔

[20]۔ کاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، 2/ 241۔

الفاظ جو صرف "رد اور جواب" (مثلاً شوہر کا کہنا: "اٹھ کھڑی ہو" یا "چلی جا") کے لیے استعمال ہوتے ہیں، ان میں شوہر یہ عذر پیش کر سکتا ہے کہ "میں نے طلاق کے مطالبے کو رد کرنے اور بیوی کو سامنے سے ہٹانے کے لیے یہ کہا تھا"، لہٰذا صرف رد و جواب کے کنایات میں اس کا دعویٰ قسم کے ساتھ مانا جائے گا، باقی تمام کنایات سے نیت کے بغیر بھی طلاقِ بائن ہو جائے گی۔

سوم: حالتِ غضب اور الفاظ کی نوعیت کا تفاوت: شدید غصے اور لڑائی جھگڑے کی حالت ایک متزلزل کیفیت ہے، جہاں شوہر غیظ و غضب میں گالی گلوچ بھی کر سکتا ہے اور رشتہ توڑنے کا ارادہ بھی کر سکتا ہے۔ اسی لیے فقہاء نے حالتِ غضب میں الفاظ کی نوعیت کے مابین فرق کیا ہے[21]:

1. الفاظِ سبّ و شتم: اگر شوہر غصے میں توہین آمیز کنائی الفاظ کہے (جیسے: "تو میری بیوی نہیں ہے")، تو ظاہرِ حال یہ قرینہ بنتا ہے کہ وہ غصے میں صرف بیوی کی تحقیر کر رہا ہے، لہٰذا یہاں نیت نہ ہونے کا دعویٰ معتبر ہو گا۔
2. الفاظِ طلاق (معین کنایات): اگر وہ غصے میں ایسے کنائی الفاظ بولے جو طلاق ہی کے لیے بنے ہیں یا جن کا لغوی رجحان علاحدگی کی طرف ہے (جیسے: "تو عدت گزار" یا "تو بالکل جدا ہے")، تو غصے کی حالت اس بات کا قوی اشارہ ہے کہ وہ رشتہ ختم کرنا چاہتا ہے، چنانچہ یہاں شوہر کی نیت کے بغیر بھی قضاءً طلاقِ بائن نافذ کر دی جائے گی۔

عرف اور عادت کی حقیقت و تشکیل:

انسانی معاشرت، تمدنی ارتقا اور باہمی روابط کے نظام میں بہت سے روزمرہ کے معاملات، لسانی تعبیرات اور حقوق و فرائض ایسے ہوتے ہیں جو کسی باقاعدہ ملکی یا تحریری قانون کے بجائے انسانوں کی باہمی سمجھ بوجھ، باہمی تعامل اور طویل عرصے سے رائج عادات پر چلتے ہیں۔ امام جرجانیؒ کتاب التعریفات میں عرف کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " الْعُرْفُ: مَا اسْتَقَرَّت النُّفُوسُ عَلَيْه بشَهَادَة الْعُقُول، وتَلَقَّتْهُ الطِّبَاعُ بِالْقَبُول" [22] (ترجمہ: عرف وہ مروجہ طریقہ ہے جو عقلوں کی گواہی سے دلوں میں راسخ ہو جائے اور انسانی طبیعتیں اسے حسنِ قبول بخشیں)۔

کنایاتِ طلاق کے ابہام کو دور کرنے اور انہیں "صریح عرفی" کے دائرے میں لانے کے لیے اس کی لغوی و اصولی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے[23]۔

عرف کی تشکیل اور نفاذ کے چار بنیادی عناصر:

کوئی بھی عام عادت یا لسانی محاورہ یک لخت قانونی یا شرعی دلیل کا درجہ اختیار نہیں کر لیتا، بلکہ اس کی تکوین اور تشکیل کے لیے درج ذیل چار اساسی اور بنیادی عناصر کا پایا جانا لازمی ہے:

1۔ تکرار اور تسلسل (Repetition and Continuity): عرف کی تشکیل کا پہلا اور اساسی عنصر یہ ہے کہ وہ محاورہ، مخصوص لفظ یا عملی طریقۂ کار معاشرے کے اندر کسی ایک آدھ واقعے کے طور پر ظاہر نہ ہو، بلکہ طویل عرصے تک بغیر کسی انقطاع (رکاوٹ) کے مسلسل اور بار بار دہرایا جا رہا ہو۔ اس تکرار کے نتیجے میں وہ لفظ یا فعل معاشرے کی اجتماعی عادت (Habit) کی شکل اختیار کر لیتا ہے[24]۔

2۔ رواجِ عام اور غلبہ (General Acceptance / Prevalence): تشکیلِ عرف کے لیے یہ شرط لازم ہے کہ وہ بات یا لسانی تعبیر کسی ایک فرد، مخصوص گھرانے یا چند اشخاص تک محدود نہ ہو، بلکہ اس پورے خطے یا معاشرے کی اکثریت اسے یکساں طور پر روزمرہ کے تعامل میں اپنا چکی ہو۔ جب تک کوئی رواج معاشرے پر غالب اور عام (Predominant) نہ ہو جائے، اس پر عام عدالتی یا فقہی احکام لاگو نہیں کیے جا سکتے[25]۔

---

[21]۔ علی بن ابی بکر مرغینانی، الہدایہ فی شرح بدایہ المبتدی (ملتان: مکتبہ امدادیہ، 1425ھ)، 2/ 252۔

[22]۔ علی بن محمد الجرجانی، کتاب التعریفات (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1983ء)، 149۔

[23]۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، 3/ 245۔

[24]۔ زین العابدین ابن نجیم، الاشباہ والنظائر علی مذہب ابی حنیفۃ النعمان (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1999ء)، 87۔

[25]۔ ابن عابدین، نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف، 2/ 115۔

3۔ ذہنی قبولیت اور تبادرِ معنوی (Mental Integration / Immediacy): لسانی و قولی عرف کی تشکیل اس وقت مکمل ہوتی ہے جب لوگوں کے ذہنوں میں اس مخصوص مبہم لفظ کا دوسرا معنی (مثلاً کنایہ لفظ کا طلاق کے معنی میں استعمال ہونا) اس طرح راسخ اور پیوست ہو جائے کہ جب بھی متکلم وہ لفظ زبان سے بولے، سننے والے کا ذہن لغوی معنی کی طرف جانے کے بجائے فوری طور پر (بلا کسی تردد اور تاویل کے) اسی مروجہ معنی کی طرف منتقل ہو جائے۔ اسے فقہ کی اصطلاح میں "تبادرِ معنوی" کہا جاتا ہے[26]۔

4۔ عدمِ مخالفت اور شرعی جواز (Non-Contravention of Shariah): یہ عرف کی تشکیل کا سب سے حساس اور کلیدی ترین عنصر ہے۔ وہ رواج، معاشرتی چلن یا لسانی محاورہ شریعتِ اسلامیہ کے کسی بھی قطعی اور بنیادی اصول، قرآن مجید کی محکم آیات، یا سنتِ ثابتہ کی نصوص کو قطعی طور پر نہ توڑتا ہو۔ اگر کوئی رواج نصِ شرعی کو معطل کرتا ہو، تو وہ "عرفِ فاسد" کہلاتا ہے جو اسلامی قانون میں یکسر باطل اور لائقِ استرداد ہے۔

عرف کی شرعی حیثیت اور اصولِ استدلال:

شرعی حجیت اور قرآنی استدلال: اسلامی قانون میں 'عرف' محض ایک سماجی رویہ نہیں ہے، بلکہ شریعتِ اسلامیہ کے ثانوی اور اجتہادی مصادر میں اسے ایک مستند ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآنِ حکیم کی نصوصِ قطعیہ صالح معاشرتی روایات اور مروجہ تعامل کی رعایت کرنے کا واضح حکم دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں بنیادی قرآنی استدلال درج ذیل نصِ مبارکہ سے قائم ہوتا ہے[27]: "خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ"[28]۔ (درگزر (کارویہ) اختیار کیجیے، اور عرف (نیک مروجہ رواج) کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے اعراض کیجیے۔"

اس آیتِ کریمہ میں امر کا صیغہ "وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ" اصولی اعتبار سے وجوب یا استحباب کی دلالت کے ساتھ معاشرتی مصلحتوں کی پاسداری کا تقاضا کرتا ہے۔ مفسرین اور اصولیین کے مابین اگرچہ لفظِ 'عرف' کی مَراد میں لغوی و اصطلاحی بحثیں موجود ہیں، تاہم اس کا بنیادی مفہوم ہر وہ "معروف" (Recognized Good) ہے جسے عقلِ سلیم، فلاحی معاشرہ اور صالح ضمیر اچھائی کے طور پر پہچانتا ہو۔ فقہی نقطۂ نظر سے یہ آیت اس امر کی صریح اور محکم بنیاد فراہم کرتی ہے کہ جو امور شریعت کے قطعی احکام سے متصادم نہ ہوں، انہیں قانونی و اخلاقی قوت کے طور پر تسلیم کیا جائے گا اور کنایاتِ طلاق کا 'صریح' کے درجے تک پہنچنا اسی قرآنی اصولِ عرف کی ایک عملی دلالت ہے[29]۔

فقہی اصول اور عرف کی قانونی حیثیت: فقہائے عظام بالخصوص ائمہ احناف نے فروعی احکام کی تخریج اور بدلتے ہوئے تمدنی تقاضوں کے پیشِ نظر عرف کو ایک مستقل قانونی ضابطے (Legal Maxim) کے طور پر برتا ہے۔ شریعت میں عرف کی اصولی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے درج ذیل دو بنیادی قواعدِ فقہیہ اساس فراہم کرتے ہیں:

پہلا قاعدہ (دلالتِ عرفی کا نص کے قائم مقام ہونا): "الثَّابِتُ بِالْعُرْفِ كَالثَّابِتِ بِالنَّصِّ"[30]۔ (جو حکم یا معاملہ عرف و رواج سے ثابت ہو، وہ ایسا ہی ہے جیسے وہ نصِ شرعی سے ثابت شدہ ہو)۔

دوسرا قاعدہ (شرطِ صریح کا متبادل): "الْمَعْرُوفُ عُرْفًا كَالْمَشْرُوطِ شَرْطًا"[31]۔ (جو بات عرف و تعامل میں پہلے سے طے شدہ اور رائج ہو، وہ قانونی طور پر ایسی ہی ہے جیسے اسے فریقین نے معاہدے میں صراحت کے ساتھ شرط کے طور پر لکھ دیا ہو)۔

---

[26]۔ احمد فراج حسین، القواعد الفقهية: الأصول والنظريات (اسکندریہ: دار الجامعة الجديدة، 2001ء)، 182۔

[27]۔ ابن عابدین، نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف، 2/ 115۔

[28]۔ القرآن الکریم: 7/ 199۔

[29]۔ جلال الدین السیوطی، الاشباہ والنظائر (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1411ھ)، 90۔

[30]۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، 3/ 296۔

[31]۔ ابن نجیم، الاشباہ والنظائر علی مذہب ابی حنیفۃ النعمان، 87۔

اصولی استدلال(Legal Argumentation): ان قواعدِ فقہیہ کی روشنی میں شارحینِ قانون کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جو عمل یا لسانی اسلوب مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت میں بطورِ خیر، مصلحت اور ضرورتِ عامہ رائج ہو جائے، اسے شریعت میں حجیت حاصل ہوتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کا موقوف اثر "ما رآہ الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللهِ حَسَنٌ"[32] اسی ضابطے کی تائید کرتا ہے، چنانچہ جب کوئی مبہم یا کنایہ لفظ عرفِ عام میں کسی ایک متعین شرعی اثر (جیسے طلاق) کے لیے اس قدر مخصوص ہو جائے کہ معاشرے پر اس کا غلبہ ہو جائے، تو وہاں "نصِ قیاسی" (منطقی قاعدے) کو ترک کر کے اسی مروجہ عرف کو مستقل قانون مانا جاتا ہے، کیونکہ عرف اپنی اثر اندازی میں لغوی ابہام کو قطعیت میں تبدیل کرنے کی مکمل طاقت رکھتا ہے[33]۔

عرف کی اقسام:

درجہ بندی کا اساسی مقصد: فقہِ اسلامی اور اصولِ فقہ میں عرف (Custom/Usage) کو محض ایک جامد تصور کے طور پر قبول نہیں کیا گیا، بلکہ معاشرتی تغیرات، لسانی ارتقاء اور انسانی معاملات کے تنوع کے پیشِ نظر ائمہ وفقہاء نے اس کی مختلف جہتوں سے درجہ بندی کی ہے۔ کسی بھی معاشرتی رواج یا لسانی محاورے کو قانونی دلیل (Legal Authority) کے طور پر تسلیم کرنے سے قبل اس کی وسعت، نوعیت اور شرعی حیثیت کا باریک بینی سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ الفاظِ طلاق بالخصوص کنایاتِ طلاق کی تفہیم، اور عربی و اردو محاورات کے تطبیقی مطالعے میں عرف کی یہ تقسیم حد درجہ اصولی اور کلیدی اہمیت اختیار کر لیتی ہے[34]۔

الف) وسعتِ جغرافیہ وافراد کے اعتبار سے (By Scope): وسعت کے اعتبار سے عرف کی دو قسمیں ہیں:

1۔ عرف عام　　2۔ عرف خاص

1۔ عرفِ عام (General Custom): عرفِ عام سے مراد وہ مسلمہ معاشرتی رواج، چلن یا لسانی محاورہ ہے جو کسی ایک مخصوص خطے، شہر یا طبقے تک محدود نہ ہو، بلکہ تمام بلادِ اسلامیہ (اسلامی دنیا) کے شہروں، زمانوں اور معاشروں میں یکساں طور پر پایا جائے اور بلا تفریق رنگ و نسل تمام مسلمان اس پر عملاً یا قولاً کاربند ہوں۔

اس کی کلاسیکی اصولی مثال "عقدِ استصناع" (Manufacture Contract / آرڈر پر چیز بنوانا) ہے۔ اگرچہ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ جو چیز ابھی عملاً وجود میں نہیں آئی اس کی بیع (خرید و فروخت) جائز نہ ہو، لیکن چونکہ تمام زمانوں اور شہروں کے مسلمانوں کا یہ عام رواج رہا ہے کہ وہ کاریگر کو آرڈر دے کر چیزیں بنواتے ہیں، اس لیے فقہاء نے عرفِ عام کی بنیاد پر قیاس کو ترک کر کے اسے جائز قرار دیا۔

عرفِ عام کو اسلامی قانون میں ایک مستقل "عام قانون" (General Law) کا درجہ حاصل ہے۔ فقہِ حنفی کا یہ مانا ہوا اصول ہے کہ عرفِ عام کی قوت اتنی شدید ہوتی ہے کہ یہ "نصِ قیاسی" (وہ اصول جو قیاسِ عقلی سے ثابت ہو) کو ترک یا معطل کرنے کی قطعی بنیاد بن سکتا ہے[35]۔

2۔ عرفِ خاص (Specific Custom): عرفِ خاص سے مراد وہ رواج، اصطلاحات یا محاورات ہیں جو کسی ایک مخصوص شہر، متعین جغرافیائی علاقے، یا کسی خاص پیشہ ور طبقے (مثلاً تاجروں، ڈاکٹروں، صرافوں یا وکلاء) کے ساتھ مخصوص ہوں اور دوسرے خطوں یا طبقوں کے لوگ اس سے ناواقف ہوں، جیسے مختلف ملکوں یا شہروں کی مروجہ کرنسی کا تفاوت، یا تاجروں کا مال میں کسی خاص پوشیدہ عیب (Defect) کی صورت میں واپسی یا ادائیگیِ قیمت کے لیے کوئی مخصوص طریقہ کار باہم طے رکھنا۔

عرفِ خاص کا اعتبار اور نفاذ صرف اور صرف اسی مخصوص طبقے، پیشہ وروں یا مخصوص خطۂ زمین کے لیے ہوتا ہے جہاں وہ رواج پایا جائے۔ اسے عرفِ عام کی طرح کائناتِ اسلام کے تمام مسلمانوں پر زبردستی مسلط نہیں کیا جا سکتا[36]۔

---

[32]۔ أحمد بن محمد بن حنبل، مسند أحمد (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، 1421ھ - 2001 م)، 6 / 84، رقم الحدیث: 3600۔

[33]۔ الزیلعی، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، 2/ 215۔

[34]۔ ابن عابدین، نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف، 2/ 116۔

[35]۔ ابو بکر بن مسعود کاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (کوئٹہ: مکتبہ رشیدیہ، 1989ء)، 5/ 223۔

[36]۔ حسین، القواعد الفقهية: الأصول والنظريات، 184۔

ب)نوعیت ومظہر کے اعتبار سے(By Nature):نوعیت کے اعتبار سے بھی عرف کی دو قسمیں ہیں:

1۔ عرفِ قولی 2۔ عرفِ فعلی

1۔ عرفِ قولی(Verbal Custom): عرفِ قولی سے مراد یہ ہے کہ کوئی لفظ یا کلام اپنی اصل لغوی یا وضعی حقیقت(Literal Meaning) کے بجائے، زبان زدِ عام ہو کر کسی دوسرے معین معنوی مفہوم میں لوگوں کے مابین اس طرح مشہور اور رائج ہو جائے کہ متکلم جب بھی وہ لفظ بولے، سننے والے کا ذہن لغوی معنی کی طرف جانے کے بجائے فوراً اسی مروجہ دوسرے معنی کی طرف منتقل ہو جائے، جیسے لفظ "ولد" لغت میں لڑکے اور لڑکی دونوں کے لیے بولا جاتا ہے، مگر عرفِ قولی میں یہ صرف بیٹے (لڑکے) کے لیے خاص ہو چکا ہے۔ اسی طرح لفظ "لحم" (گوشت) لغوی طور پر مچھلی کے گوشت کو بھی شامل ہے، مگر معاشرتی عرفِ قولی میں مچھلی کو عام گوشت کے زمرے سے الگ سمجھا جاتا ہے۔

کنایاتِ طلاق کی تفہیم، ان کی صراحتِ عرفی اور ابہام کو دور کرنے میں عرفِ قولی ہی سب سے زیادہ بنیادی اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ جب کنائی الفاظ (جیسے اردو کا محاورہ: "میں نے تجھے فارغ کر دیا") لغت میں طلاق کے لیے نہیں بنے، مگر عرفِ قولی میں طلاق کے لیے متعین ہو جائیں تو ان کا شرعی حکم بدل جاتا ہے[37]۔

2۔ عرفِ فعلی(Practical Custom): عرفِ فعلی سے مراد یہ ہے کہ لوگ کسی معاملے کو زبان سے بولے بغیر، اپنے باہمی تعامل اور روزمرہ کے مروجہ افعال کے ذریعے عملاً رواج کے طور پر اختیار کر لیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال تجارت اور لین دین میں "بیعِ تعاطی" (Sale by Conduct) ہے، یعنی دکاندار کو پیسے دینا اور بغیر کچھ بولے یا ایجاب و قبول کے صیغے ادا کیے، دکان سے مال اٹھا لینا۔ یہ طریقۂ کار کسی تحریری یا زبانی معاہدے کے بغیر بھی پورے معاشرے میں نافذ العمل اور شرعاً معتبر سمجھا جاتا ہے[38]۔

ج)شرعی قبولیت وعدمِ قبولیت کے اعتبار سے(By Shariah Status):اس اعتبار سے بھی عرف کی دو قسمیں ہیں:

1۔ عرفِ صحیح 2۔ عرفِ فاسد

1۔ عرفِ صحیح(Valid/Approved Custom): عرفِ صحیح سے مراد وہ مروجہ عادات، لغات اور معاشرتی افعال ہیں جنہیں عقلِ سلیم (Sound Intellect) اچھائی کے طور پر قبول کرے، جو انسانی مصلحتوں کے تحفظ کا ذریعہ ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شریعتِ اسلامیہ کے کسی بھی قطعی اصول، قرآن مجید کی نص اور سنتِ ثابتہ کے احکام کے معارض (خلاف) نہ ہوں۔ اس قسم کے رواج پر عملاً کاربند رہنا اور اس کی روشنی میں قانونی و فقہی فیصلے صادر کرنا نہ صرف درست ہے، بلکہ شرعاً لازم و ضروری ہے کیونکہ یہ شریعت کے اساسی مقصد "مصلحتِ عامہ" اور "رفعِ حرج" (تنگی دور کرنے) کے عین مطابق ہوتا ہے۔

2۔ عرفِ فاسد(Invalid/Void Custom): عرفِ فاسد سے مراد وہ جاہلانہ، غیر اخلاقی یا مروجہ رسوم و رواج ہیں جو اپنے ظہور یا باطنی حقیقت میں شریعتِ مطہرہ کے کسی واضح حکم، قطعی نص، یا حلال و حرام کی متعین کردہ حدود سے براہِ راست ٹکراتے ہوں، جیسے کسی معاشرے یا تاجروں کے طبقے میں سود (Usury/Riba) کا لین دین حد درجہ عام اور رائج ہو جائے، جوا کھیلنے کو رواج حاصل ہو جائے، یا نکاح و طلاق کے معاملات میں ایسی جاہلانہ رسومات (مثلاً وٹہ سٹہ یا قرآن سے شادی) مروج ہو جائیں جو حقوقِ عباد اور احکامِ الٰہیہ کو پامال کرتی ہوں۔

عرفِ فاسد شرعاً، قانوناً اور قضاءً یکسر باطل، مردود اور کالعدم ہے۔ محض "رواج" یا "معاشرے کا چلن" ہونے کے نام پر اسے کبھی بھی قبول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اصولِ فقہ کا یہ طے شدہ ضابطہ ہے کہ "العرف لا تقوی علی معارضة النص" (رواج میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ نصِ الٰہی کو معطل یا تبدیل کر سکے)[39]۔

عرف کے معتبر ہونے کی شرائط:

اسلامی قانون میں اگرچہ عرف اور معاشرتی رواج کو احکام کے نفاذ اور متکلم کی مراد سمجھنے کے لیے ایک قانونی دلیل اور مأخذِ شریعت تسلیم کیا گیا ہے، لیکن یہ

---

[37]۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، 3/ 245۔

[38]۔ علی بن ابی بکر مرغینانی، الہدایہ فی شرح بدایہ المبتدی (ملتان: مکتبہ امدادیہ، 1425ھ)، 3/ 22۔

[39]۔ ابن عابدین، نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف، 2/ 120۔

اباحت مطلق یا غیر مشروط نہیں ہے۔ فقہاء اور مجتہدین نے جاہلانہ رسومات اور شریعت کے مزاج کے منافی عادات کو قانونی تحفظ سے روکنے کے لیے نہایت سخت اور جامع ضوابط مقرر کیے ہیں۔ کسی بھی دور، خطے یا لسانی معاشرے کے عرف کو شرعی و عدالتی فیصلوں میں "حکم" (قاضی یا فیصل) کا درجہ حاصل ہونے کے لیے درج ذیل چار بنیادی اور اساسی شرائط کا پایا جانا شرعاً و قانوناً لازمی ہے، ورنہ وہ رواج شرعی اعتبار سے کالعدم تصور ہو گا [40]:

1۔ غلبہ اور تسلسل (Continuity and Dominance / الإطراد أو الغلبة): عرف کے معتبر ہونے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ رواج یا لسانی محاورہ معاشرے میں اس طرح رائج ہو کہ وہ مستقل (مُطّرِد) ہو، یا کم از کم معاشرتی تعامل میں کثرت کے ساتھ (غالب مروجہ طریقے کے طور پر) پایا جاتا ہو، لہٰذا اگر کوئی فعل، عادت یا لفظی اصطلاح کسی معاشرے میں کبھی کبھار (شاذ و نادر) ظاہر ہو یا اس پر عمل کرنے والے چند افراد ہوں، تو اسے قانون کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ کنایاتِ طلاق میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی مبہم لفظ بولا جائے، تو وہ معاشرے کے محض چند گھرانوں میں نہیں بلکہ پورے خطے کے لسانی رواج میں طلاق کے معنی کے لیے کثرت سے مستعمل اور غالب ہو چکا ہو۔ علامہ ابن نجیم الاشباہ والنظائر میں فرماتے ہیں: " إِنَّمَا تُعْتَبَرُ الْعَادَةُ إِذَا اضْطَرَدَتْ أَوْ غَلَبَتْ" [41]۔ (عادت اور رواج کا اعتبار اسی وقت ہوتا ہے جب وہ مستقل ہو یا معاشرے پر غالب ہو)۔

2۔ معاملے کے وقت موجودگی (Existence at the Time of Transaction / المقارنة): عرف کا قانونی اعتبار اسی صورت میں ہوتا ہے جب وہ متعلقہ معاہدہ، عقد یا کلام کے صادر ہوتے وقت معاشرے میں عملاً قائم اور موجود ہو۔ بعد کے ادوار میں پیدا ہونے والے نئے لسانی محاورات یا رواج کا اطلاق ماضی میں گزرے ہوئے معاملات اور پرانے کلام پر نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ اگر کسی شوہر نے چند سال پہلے ایک ایسا کنائی لفظ بولا تھا جو اس وقت طلاق کے لیے مروج نہیں تھا، لیکن آج کے عرف میں وہ طلاق کا صریح محاورہ بن چکا ہے تو اس شوہر کے پرانے کلام پر آج کے نئے عرف کا حکم نافذ کر کے طلاق کا فیصلہ نہیں دیا جائے گا، بلکہ اس وقت کے رواج کو ہی بنیاد بنایا جائے گا [42]۔

3۔ واضح شرطِ صریح کی عدم موجودگی (Absence of an Explicit Stipulation / عدم التصريح بخلافه): عرف کا نفاذ اور دلالت صرف اسی صورت میں قابلِ قبول ہوتی ہے جب فریقینِ معاہدہ یا متکلم اپنے کلام میں خاموش رہیں۔ اگر فریقین نے مروجہ رواج کے خلاف کوئی واضح اور صریح شرط پہلے ہی سے طے کر لی ہو تو رواج کی قانونی حیثیت یکسر ختم ہو جاتی ہے اور وہ صریح شرط نافذ العمل ہوتی ہے۔ اصولِ فقہ کا مانا ہوا ضابطہ ہے کہ "الصريح يفوق الدلالة" (صراحت دلالت پر مقدم ہوتی ہے)۔ اگر کسی علاقے کے عرف میں ایک کنائی جملہ طلاق کے لیے مروج ہو، مگر شوہر وہ جملہ بولنے سے پہلے یا بولتے وقت صراحت کر دے کہ "میری مراد اس لفظ سے طلاق نہیں بلکہ محض ڈانٹنا ہے"، تو اس کی یہ صراحت معاشرتی عرف پر مقدم مانی جائے گی اور رواج کی بنیاد پر اس پر طلاق کا حکم نہیں لگایا جائے گا [43]۔

4۔ شریعت سے مکمل مطابقت اور عدمِ مخالفت (Compliance with Shariah / عدم مخالفة النص): یہ عرف کے معتبر ہونے کی سب سے اہم، اعلیٰ اور بنیادی ترین شرط ہے۔ کوئی بھی معاشرتی رواج، چلن یا لسانی استعمال شرعاً اسی وقت وزن رکھتا ہے جب وہ قرآن مجید کی کسی نص، سنتِ ثابتہ کے احکام، یا شریعتِ اسلامیہ کے قائم کردہ حلال و حرام کے قطعی اصولوں سے نہ ٹکراتا ہو، لہٰذا اگر کوئی رواج نصِ شرعی کے معارض (خلاف) آ جائے تو وہ "عرفِ فاسد" کہلاتا ہے جو شرعاً باطل اور مردود ہے۔ طلاق کے باب میں اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی جاہلانہ معاشرے میں یہ رواج پڑ جائے کہ "غصے میں دی گئی طلاق، طلاق ہی نہیں ہوتی" یا "جب تک برادری کے سامنے طلاق نہ دی جائے واقع نہیں ہوتی"، تو ایسا رواج نصِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ کے صریح خلاف ہونے کی بنا پر یکسر مسترد کر دیا جائے گا، کیونکہ

---

[40]۔ ابن عابدین، نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف، 2/ 125۔

[41]۔ زین العابدین ابن نجیم، الاشباہ والنظائر علی مذہب ابی حنیفۃ النعمان (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1999ء)، 87۔

[42]۔ جلال الدین سیوطی، الاشباہ والنظائر فی قواعد و فروع فقہ الشافعیہ (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2002ء)، 92۔

[43]۔ حسین، القواعد الفقہیۃ: الأصول والنظریات، 190۔

رواجِ عام کی خاطر احکام الٰہی کو بدلا یا معطل نہیں کیا جاسکتا [44]۔

10۔ تبدیلیِ زمانہ اور احکامِ شرعیہ:

اسلامی قانون کی لچک، آفاقیت اور رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کی صلاحیت کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے ثبات اور تغیر (Stability and Change) کے مابین ایک نہایت متوازن اور حکیمانہ نظام وضع کیا ہے [45]۔ شریعتِ اسلامیہ میں جہاں بعض احکام اپنی جگہ پر بالکل جامد اور ابدی ہیں، وہیں ایک بڑا حصہ ایسا بھی ہے جس کا تعلق انسانی مصلحتوں اور معاشرتی عادات و رواج سے ہے۔ فقہائے احناف اور متاخرینِ ائمہ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ معاشرتی ارتقاء، حالات کے بدلنے اور عرف و لغت میں تبدیلی آنے سے وہ احکام جو عرف پر مبنی تھے، تبدیل ہو جاتے ہیں تاکہ شریعت کا اساسی منشاء یعنی لوگوں سے حرج (تنگی) دور کرنا اور عدل و انصاف قائم کرنا عملاً بر قرار رہے۔

10.2 تبدیلیِ احکام کے اصولی قواعد: تبدیلی احکام کے اصولی قواعد حسب ذیل ہیں:

1۔ عرف پر مبنی احکام (Custom-Based Rulings): شریعت کے وہ احکام جن کی تشریع اور نفاذ کی اساسی بنیاد کسی مخصوص دور کا عرف، مروجہ معاشرتی رواج یا مصلحتِ وقت پر تھی، وہ معاشرتی تبدیلیوں، زمانی و مکانی تغیرات اور لغت کے بدلنے کے مطابق بدل سکتے ہیں اور بدل جاتے ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اس فقہی ضابطے کو اپنے رسالے میں یوں مدون فرمایا ہے: " الْأَحْكَامُ الَّتِي تَبْتَنِي عَلَى الْعُرْفِ وَالْعَادَةِ تَتَبَدَّلُ بِتَبَدُّلِ الزَّمَانِ " [46]۔ (وہ احکام جن کی بنیاد عرف اور عادت پر ہوتی ہے، وہ زمانے کے بدلنے سے تبدیل ہو جاتے ہیں)۔

2۔ قطعی نصوص پر مبنی احکام (Immutable Rulings Based on Texts): وہ تمام احکام جو قرآن مجید کی محکم آیات، احادیثِ متواترہ یا نصوصِ قطعیہ کے صریح احکام پر مبنی ہیں، وہ ابدی، مستقل اور دائمی ہیں۔ ان احکام میں قیامت تک کسی بھی دور کے رواج، برادری کے دباؤ یا جدید قانون کے نام پر کسی قسم کی تبدیلی، ترمیم یا تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسے ابدی احکام کو زمانے کے رواج کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا۔

3۔ مفتی اور قاضی کی قانونی ذمہ داری (Responsibility of Jurist and Judge): ایک جید مفتی، قانونی ماہر (Jurist) اور قاضیِ وقت کے لیے جہاں کتاب و سنت کے علوم پر دسترس ضروری ہے، وہیں اپنے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات، معاشرتی نفسیات اور روزمرہ کے لسانی رواجوں (Verbal Customs) سے مکمل واقفیت بھی حد درجہ لازمی ہے۔ اگر کوئی مفتی اپنے زمانے کے عرف سے جاہل ہو تو وہ پرانی کتب میں درج جزئیات کو من و عن ایسے الفاظ پر فٹ کر دے گا جن کا مفہوم بدل چکا ہے، اور یوں وہ مصلحت کے بجائے معاشرے میں ظلم اور تنگی کا سبب بن جائے گا [47]۔ اسی لیے ائمہ فرماتے ہیں: " مَنْ لَمْ يَعْرِفْ أَهْلَ زَمَانِهِ فَهُوَ جَاهِلٌ " [48]۔ (جو اپنے زمانے کے لوگوں کے عرف کو نہیں جانتا، وہ جاہل ہے)۔

4۔ اعتبارِ زمانہ کی اصولی شرط (The Essential Condition): زمانے کی تبدیلی، جدید تقاضوں اور رواج کا اعتبار صرف اور صرف وہیں تک قانونی طور پر جائز ہو گا جہاں اس تبدیلی کے نتیجے میں شریعتِ مطہرہ کے کسی بنیادی عقیدے، مسلمہ اصول یا قطعی نص (قرآن و سنت) کی معارَضت یا خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو۔ ہر وہ جدید رواج جو نص کو پامال کرے، وہ عرفِ فاسد ہے اور لائق استرداد ہے۔

عربی زبان میں کنایاتِ طلاق پر عرف کے اثرات:

لسانی ارتقاء اور معاشرتی تعامل کے نتیجے میں الفاظ کے معانی اور ان کی دلالتیں مستقل ایک حالت پر قائم نہیں رہتیں۔ علمِ اصولِ فقہ کا یہ مانا ہوا قاعدہ ہے کہ

---

[44]۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، 3/ 250۔

[45]۔ مصطفیٰ احمد زرقاء، المدخل الفقهي العام (دمشق: دار الفكر، 1998ء)، 2/ 925۔

[46]۔ ابن عابدین، نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف، 2/ 130۔

[47]۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، 3/ 252۔

[48]۔ آفندی، علی حیدر خواجہ امین، درر الحکام فی شرح مجلۃ الأحکام (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1991ء)، 4/ 618۔

جب کوئی کنائی یا مبہم لفظ کسی معاشرے کے عرفِ قولی (Verbal Custom) میں اس حد تک کثرت کے ساتھ استعمال ہونے لگے کہ بولتے ہی لغوی معنی کے بجائے صرف ایک خاص شرعی یا قانونی معنی (مثلاً طلاق) ہی ذہن میں متبادر ہو تو وہ لفظ اپنے لغوی ابہام اور کنائی حیثیت سے نکل کر "صریح عرفی" (Customary Explicit) کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔

عربی زبان کے کلاسیکی فتاویٰ اور کتبِ فقہ کا گہرا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ متقدمین اور متاخرین فقہاء کے ادوار کے مابین عرب معاشرے کے لسانی عرف میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں[49]۔ بعض الفاظ جو عہدِ رسالت یا دورِ صحابہ میں محض کنایہ تھے اور جن میں طلاق کے علاوہ دیگر معانی کا برابر احتمال تھا، وہ بعد کے عرب عرف میں طلاق کے لیے اس حد تک متعین اور دوٹوک ہو گئے کہ فقہائے احناف نے ان پر کنایہ کے بجائے صریح کے احکام جاری کیے اور وقوعِ طلاق کے لیے شوہر کی دلی نیت کی شرط کو یکسر ختم کر دیا۔ ذیل میں عربی عرف کی تین مستند اور کلیدی مثالیں تفصیلاً پیش کی جا رہی ہیں:

عربی کنایات پر عرف کے اثرات کی مروجہ مثالیں: عربی کنایات پر عرف کے اثرات کی مروجہ کچھ مثالیں حسب ذیل ہیں:

1۔ لفظِ "سَرَّحْتُکِ" یا "سراح" : عربی لغت میں مادہ (س ر ح) سے مشتق اس لفظ کے بنیادی معنی "کسی کو رخصت کرنے"، "چھوڑ دینے"، یا "مویشیوں کو چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینے" کے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی لغوی معنی (خوبصورتی کے ساتھ رخصت کرنے) میں استعمال ہوا ہے، جیسے: "وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا"[50] (اور انہیں اچھے طریقے سے رخصت کر دو)۔

اگرچہ ائمہ متقدمین کے ہاں یہ لفظ کنایاتِ طلاق کے زمرے میں آتا تھا جس کے لیے نیت شرط تھی، لیکن بعد کے ادوار میں عربی عرفِ عام میں یہ لفظ طلاق کے مفہوم میں اس قدر کثرت سے مستعمل اور معروف ہوا کہ اس نے طلاقِ صریح کا درجہ حاصل کر لیا۔ فقہائے احناف کے معتبر متن "الدر المختار" میں علامہ حصکفیؒ صراحت فرماتے ہیں کہ مروجہ عربی عرف کی بنا پر لفظِ "سراح" اب صریح کے حکم میں ہے۔ چنانچہ اگر کوئی عرب شوہر اپنی بیوی سے کہے "سَرَّحْتُکِ" تو بغیر نیت کے بھی فوری طور پر طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ لغوی رخصت کا احتمال عرف نے یکسر ختم کر دیا ہے[51]۔

2۔ لفظِ "بائن" یا "بینٌ": عربی لغت میں مادہ (ب ی ن) سے مشتق اس لفظ کے بنیادی معنی "علاحدگی"، "جدا ہونے"، یا "فاصلہ پیدا ہو جانے" کے ہیں۔ یہ لفظ میاں بیوی کے مابین عارضی ناراضی یا جسمانی دوری کے لیے بھی بولا جا سکتا تھا، لیکن عرب عوام کے تعامل اور مروجہ عرفِ قولی میں یہ لفظ رشتۂ نکاح کے مکمل خاتمے اور قطعی جدائی (طلاق) کے لیے اس قدر مشرق و مغرب میں مشہور ہوا کہ اس کا لغوی مفہوم بالکل پسِ پشت چلا گیا۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ "رد المحتار" میں اس لسانی تبدیلی کی توثیق کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ چونکہ ہمارے زمانے کے عرف میں عوام لفظِ "بائن" صرف طلاق ہی کے لیے بولتے ہیں، اس لیے اب یہ کنایہ نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ فتاویٰ عالمگیری (الفتاویٰ الہندیہ) کے مطابق اگر شوہر کہے "أنت بائن" (تو بائن ہے)، تو دلی نیت اور ارادے کے بغیر بھی قضاءً طلاقِ بائن نافذ ہو جائے گی کیونکہ عرف نے اسے صراحت کا لبادہ اڑھا دیا ہے[52]۔

3۔ جملہ "أَنْتِ عَلَيَّ حَرام" : اس جملے کا لغوی اور معنوی مفہوم یہ ہے کہ "تو مجھ پر حرام ہے"۔ اس جملے میں کئی احتمالات پائے جاتے تھے؛ مثلاً اس سے شوہر کی مراد طلاق بھی ہو سکتی تھی، ظہار بھی، ایلاء بھی اور محض جھوٹ یا بیوی سے عارضی پرہیز بھی۔ اسی لیے متقدمین کے ہاں اس سے طلاقِ بائن کے وقوع کے لیے صریح نیت کا ہونا اولین شرط تھی۔

تبدیلی عرف اور فقہی حکم: جب عربی معاشرے میں یہ جملہ غصے یا جھگڑے کے وقت صرف اور صرف طلاق دینے کے لیے ہی خاص ہو گیا تو فقہائے احناف نے متکلم کی نیت کی تفتیش کرنا چھوڑ دی۔ ائمہ احناف کا یہ مسلمہ اور متفق علیہ فتویٰ بن گیا کہ عربی عرف کی قطعی دلالت کی بنا پر اب اس جملے کے ادا ہوتے ہی بغیر کسی نیت اور ارادے

---

[49]۔ ابن عابدین، نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف، 2/ 138۔

[50]۔ القرآن: 33/ 49۔

[51]۔ محمد علاء الدین حصکفی، الدر المختار فی شرح تنویر الابصار (بیروت: دار الفکر، 1992ء)، 3/ 298۔

[52]۔ شیخ نظام الدین اور علمائے ہند، الفتاویٰ الہندیہ (کوئٹہ: مکتبہ ماجدیہ، 1983ء)، 1/ 379۔

کے طلاقِ بائن واقع ہو جائے گی[53]۔ عرفِ عام نے اس جملے کے دیگر تمام احتمالات (جیسے ظہار یا محض قسم) کو مسترد کر کے اسے حرمتِ نکاح کے معنی میں متعین کر دیا۔

12۔ اردو محاورات پر عرف کے اطلاقی اثرات:

اسلامی قانون کا یہ ایک مسلمہ اور ابدی اصول ہے کہ زبانوں کے بدلنے اور جغرافیائی حدود کے تغیر سے احکامِ شرعیہ کے بنیادی مقاصد تبدیل نہیں ہوتے، بلکہ ان احکام کو سمجھنے کے لیے اس مخصوص خطے کی لغت اور لسانی عادات کو حکم (فیصل) بنایا جاتا ہے۔ پاک و ہند (برصغیر) کا مخصوص معاشرتی اور لسانی عرف عربی زبان کے کلاسیکی ماحول سے یکسر مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے جید فقہاء اور مفتیانِ کرام نے ان کنائی الفاظ و محاورات کے اطلاقات کا از سرِ نو شرعی جائزہ لیا ہے جن کی تفاصیل قدیم عربی فقہ کی کتب (مثلاً الہدایہ یا الفتاویٰ الہندیہ) میں ملتی ہیں۔ اردو زبان میں مستعمل بہت سے جملے جو لغتِ عرب کے مروجہ کنایات کا متبادل دکھائی دیتے ہیں، وہ برصغیر کے عرفِ قولی (Verbal Custom) میں اپنے اندر بالکل الگ قانونی اثرات رکھتے ہیں[54]۔

فقہی اصول کا اطلاق (صریحِ عرفی کا ضابطہ): علمِ اصولِ فقہ کا اصول ہے کہ: "المتكلم إنما يتكلم على عرفه وعادته"[55]۔ (متکلم عرف اور محاورے کے مطابق ہی بات کیا کرتا ہے)، لہٰذا جب متکلم کوئی مبہم یا ذو معنی لفظ استعمال کرے اور کسی خاص خطہ زمین کے "عرفِ قولی" میں وہ طلاق کے معنی کے لیے اس قدر کثرت سے مستعمل اور مشہور ہو جائے کہ بولتے وقت یا سنتے وقت عام معاشرے میں اس سے طلاق کے علاوہ کوئی دوسرا دنیوی یا اخلاقی معنی متبادر ہی نہ ہوتا ہو تو وہ لفظ فقہی و قانونی طور پر اپنا کنائی ابہام کھو دیتا ہے اور "صریحِ عرفی" کا حکم اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورت میں اس لفظ سے طلاق واقع ہونے کے لیے شوہر کی قلبی نیت یا ارادے کی شرط بالاتفاق ختم ہو جاتی ہے۔

نیت اور دلالتِ حال کا قضائی تصادم: جدید اردو معاشرے میں جب میاں بیوی کے مابین شدید تنازعات، غصے یا مذاکرۂ طلاق کے دوران کنائی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں تو عدالتی و قضائی سطح پر دلالتِ حال (Socio-situational Context / حالات کے تقاضے) کو شوہر کے اس ظاہری دعوے پر ترجیح دی جاتی ہے کہ "میری نیت طلاق کی نہیں تھی"۔ فقہِ حنفی کا یہ طے شدہ ضابطہ ہے کہ جب ظاہرِ حال اور متکلم کا بیان باہم ٹکرا جائیں اور ظاہرِ حال کی تائید اس خطے کا عرف بھی کر رہا ہو تو متکلم کے دلی ارادے کے اعتراف کو تسلیم نہیں کیا جائے گا بلکہ ظاہرِ حال کے مطابق طلاقِ بائن کے وقوع کا فیصلہ صادر کر دیا جائے گا تاکہ شریعت کی حدود کا تحفظ ہو سکے[56]۔

اردو محاورات پر عرفی اثرات کا تطبیقی مطالعہ:

برصغیر پاک و ہند کے لسانی و معاشرتی عرف نے طلاق کے کنائی کلمات اور مبہم تعبیرات کو جس طرح "صریحِ عرفی" کے دائرے میں منتقل کیا ہے، اس کی چند واضح اور مستند فقہی مثالیں درج ذیل ہیں:

1۔ "میں نے تمہیں آزاد کر دیا": یہ جملہ لغوی اعتبار سے کنایاتِ طلاق میں شمار ہوتا ہے کیونکہ آزادی کا لفظ غلامی سے مخلصی یا کسی قید سے رہائی کے عمومی معانی پر مشتمل ہے، لیکن برصغیر کے موجودہ عرف اور بول چال میں یہ لفظ اب محض کنایہ نہیں رہا بلکہ صریحِ عرفی کا درجہ اختیار کر چکا ہے، لہٰذا دلالتِ عرف کے اسی غلبے کی بنا پر اب اس جملے سے متکلم کی نیت کے بغیر بھی طلاقِ بائن واقع ہو جاتی ہے کیونکہ عرف نے اس کے لغوی ابہام کو حتمی قانونی حکم میں بدل دیا ہے[57]۔

2۔ طلاق کے تذکرے میں صرف اعداد ("ایک، دو، تین") ذکر کرنا: لسانی اور عددی اعتبار سے گنتی کے یہ الفاظ محض اعداد کی دلالت رکھتے ہیں جن کا طلاق سے کوئی مستقل لغوی تعلق نہیں ہے، لیکن جب معاشرے میں طلاق کا تذکرہ یا مذاکرہ چل رہا ہو اور شوہر صرف "ایک، دو، تین" کے الفاظ بول دے، تو دیوبندی مکتبِ فکر کے مسلمہ فتاویٰ کی صراحت کے مطابق، برصغیر کے عرف کی وجہ سے یہ الفاظ صریحِ طلاق کے قائم مقام مانے جائیں گے۔ یہاں الفاظ کی اپنی لغوی حیثیت مفسوخ ہو جاتی ہے

---

[53]۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، 3/ 247۔

[54]۔ مفتی محمد شفیع عثمانی، امداد المفتین (کراچی: دار الاشاعت، 2002ء)، 542۔

[55]۔ ابن عابدین، شرح عقود رسم المفتی (راولپنڈی: مکتبہ عثمانیہ، 2016ء)، 123۔

[56]۔ عثمانی، مفتی عزیز الرحمن، عزیز الفتاویٰ فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند (کراچی: دار الاشاعت، 2002ء)، 448۔

[57]۔ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، 3/ 246۔

اور عرفی غلبہ نیت سے بے نیاز کر کے طلاقِ مغلظہ کا حکم ثابت کر دیتا ہے[58]۔

اس کے برعکس خیبر پختونخوا کا عرف چونکہ پنجاب وغیرہ کے عرف سے مختلف ہے۔اس لیے فتاویٰ فریدیہ میں مفتی فرید صاحبؒ نے یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے کہ اعداد طلاق کے لیے صریح ہیں نہ کنایہ ہیں۔اس لیے جب تک طلاق کا لفظ زبان سے ادا نہ کیا جائے تو طلاق واقع نہیں ہو گی، لہٰذا محض مفرد اعداد (ایک، دو، تین) بولنے سے طلاق واقع نہیں ہو گی[59]۔

3۔بیوی کو "ماں بہن کہنا: یہ جملہ اصالتاً تشبیہ اور تکریم یا غصے کی ایک مبہم تعبیر ہے، لیکن برصغیر کے خاندانی تعامل اور شدید غصے کی حالت میں شوہر کا بیوی سے یہ جملہ کہنا عرفِ عام میں جدائی اور قطعِ تعلق کی علامت بن چکا ہے۔معاصر احناف کے مستند فتاویٰ کے مطابق اس عرفی اسلوبِ مخاطبت کی وجہ سے یہ جملہ اب نیت کا محتاج نہیں رہا، بلکہ شوہر کے اس مروجہ کلام سے بغیر نیت کے بھی طلاقِ بائن واقع ہو جاتی ہے، کیونکہ عرفِ زمان و مکان نے اس جملے کے کنائی ابہام کو صریح قانونی علیحدگی میں تبدیل کر دیا ہے[60]۔

تاہم دیگر علمائے کرام نے بیوی کو ماں بہن کہنے سے طلاق کا عرف نہ ہونے کی وجہ سے اسے طلاق کے لیے کنایہ نہیں مانا۔اس لیے ان کے نزدیک بیوی کو ماں بہن کہنے سے طلاق واقع نہیں ہو گی[61]۔

تحقیق کے نتائج (Research Findings):

1. صریح عرفی: عرفِ عام بعض کنائی الفاظ کو "صریح عرفی" میں تبدیل کر دیتا ہے، جس سے ان کے شرعی احکام بدل جاتے ہیں۔
2. عرف کی بنیادی حیثیت: فقہائے احناف نے کنایاتِ طلاق میں دلالتِ حال اور عرفِ معاشرہ کو بنیادی حیثیت دی ہے۔
3. لسانی ارتقا: عربی اور اردو دونوں زبانوں میں بعض الفاظ عرفی ارتقا کے باعث طلاق کے مخصوص مفہوم کے لیے معروف ہو چکے ہیں۔
4. اردو محاورات کی حیثیت: برصغیر کے موجودہ عرف نے کئی اردو محاورات کو عملاً طور پر صریح طلاق کے قریب کر دیا ہے۔
5. ڈیجیٹل ذرائع کا اثر: جدید ڈیجیٹل ذرائع ابلاغ (میسجز، ای میلز، سوشل میڈیا) نے کنایاتِ طلاق کے فقہی اطلاقات میں نئی پیچیدگیاں پیدا کی ہیں۔

سفارشات (Recommendations):

1. فقہی لغت کی تدوین: اردو اور مقامی زبانوں کے کنایاتِ طلاق پر مشتمل ایک جامع "فقہی لغت" مرتب کی جائے۔
2. عدالتی معاونت: طلاق کے عدالتی مقدمات میں لسانی و عرفی ماہرین سے لازمی معاونت لی جائے۔
3. عوامی شعور: عوام میں کنایاتِ طلاق کے سنگین شرعی نتائج سے متعلق آگاہی پیدا کی جائے۔
4. مفتیانِ عظام کو کنایاتِ طلاق سے متعلق فتوی دیتے وقت عرف اور محاورے کو کسی صورت نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

کتابیات (Bibliography)

1. القرآن
2. ابن حنبل، أحمد بن محمد بن حنبل، مسند أحمد۔ بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ۔ 1421ھ - 2001 م۔
3. ابن عابدین، محمد امین۔ رد المحتار علی الدر المختار۔ کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، 1986ء۔
4. ابن عابدین، محمد امین۔ نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف۔ لاہور: سہیل اکیڈمی، 2004ء۔
5. ابن عابدین، محمد امین۔ شرح عقود رسم المفتی۔ راولپنڈی: مکتبہ عثمانیہ، 2016ء۔

---

[58]۔ لاجپوری، مفتی عبد الرحیم، فتاوی رحیمیہ (کراچی: دار الاشاعت، 2005ء)، 8/ 264۔

[59]۔ مفتی فرید حقانی، فتاویٰ فریدیہ (صوابی: دار العلوم صدیقہ زروبی، 2005ء)، 5/ 433۔

[60]۔ مفتی رشید احمد لدھیانوی، احسن الفتاویٰ (کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، 1995ء)، 5/ 168۔

[61]۔ مولانا اشرف علی تھانوی، امداد الفتاویٰ (کراچی: مکتبہ دار العلوم کراچی، 2010ء)، 2/ 476۔

6. ابن منظور، محمد بن مکرم۔ لسان العرب۔ بیروت: دار صادر، 2004ء۔
7. ابن نجیم، زین العابدین۔ الاشباہ والنظائر علی مذہب ابی حنیفۃ النعمان۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1999ء۔
8. آفندی، علی حیدر خواجہ امین۔ درر الحکام في شرح مجلۃ الأحکام۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1991ء۔
9. ترمذی، محمد بن عیسیٰ۔ سنن الترمذی۔ بیروت: دار الغرب الاسلامی، 1998ء۔
10. جرجانی، علی بن محمد۔ کتاب التعریفات۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1983ء۔
11. حسین، احمد فراج۔ القواعد الفقہیۃ: الأصول والنظریات۔ اسکندریہ: دار الجامعۃ الجدیدۃ، 2001ء۔
12. حصکفی، محمد علاء الدین۔ الدر المختار فی شرح تنویر الابصار۔ بیروت: دار الفکر، 1992ء۔
13. حقانی، مفتی فرید۔ فتاوی فریدیہ۔ صوابی: دار العلوم صدیقہ زروبی، 2005ء۔
14. زرقاء، مصطفیٰ احمد۔ المدخل الفقہي العام۔ دمشق: دار الفکر، 1998ء۔
15. زیلعی، فخر الدین عثمان بن علی۔ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2000ء۔
16. زیلعی، فخر الدین عثمان بن علی۔ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق۔ قاہرہ: المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ، 1313ھ۔
17. سجستانی، سلیمان بن اشعث۔ سنن ابی داؤد۔ بیروت: المکتبۃ العصریۃ، 2009ء۔
18. سیوطی، جلال الدین۔ الاشباہ والنظائر فی قواعد وفروع فقہ الشافعیہ۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2002ء۔
19. عثمانی، مفتی عزیز الرحمن۔ عزیز الفتاویٰ فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند۔ کراچی: دار الاشاعت، 2002ء۔
20. عثمانی، مفتی محمد شفیع۔ امداد المفتین۔ کراچی: دار الاشاعت, 2002ء۔
21. کاسانی، ابو بکر بن مسعود۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع۔ کوئٹہ: مکتبہ رشیدیہ، 1989ء۔
22. لاجپوری، مفتی عبد الرحیم۔ فتاوی رحیمیہ۔ کراچی: دار الاشاعت، 2005ء۔
23. لدھیانوی، مفتی رشید احمد۔ احسن الفتاوی۔ کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، 1995ء۔
24. مرغینانی، علی بن ابی بکر۔ الہدایہ فی شرح بدایہ المبتدی۔ ملتان: مکتبہ امدادیہ، 1425ھ۔
25. نظام الدین، شیخ اور علمائے ہند۔ الفتاویٰ الہندیہ۔ کوئٹہ: مکتبہ ماجدیہ، ن۔د۔